رولاک
ناول
رفاقت حیات

رولاک

ناول

رفاقت حیات

1

اپنی گزری زندگی میرے لیے ہمیشہ ابہام میں چھپی رہتی، اگر میرا ذہن وہ ہیجان خیز، ملال بھرے، سنگین اور اذیت ناک واقعات کھنگالنا شروع نہ کرتا، جنھیں اپنی یادداشت میں از سرِ نو زندہ کرنے کے بعد میرے شعور و لاشعور کی پنہائیوں سے ابہام دھیرے دھیرے چھٹنے لگا، لیکن یہ طویل، تھکا دینے والا، جاں کاہ عمل، مجھے ایک اذیت پسندی کے علاوہ ایک غلیظ قسم کی لت میں مبتلا کر گیا۔ اپنی گزری زندگی اور اس میں شامل لوگوں سے جڑی تفصیلات کریدنے، ان میں جھانکنے، انھیں جوڑ کر واقعات یاد کرنے اور اپنی بساط کے مطابق ان کا تجزیہ کرنے کی لت میں۔ اس عمل کے دوران کئی بار میری یادداشت نے ساتھ چھوڑ دیا اور میرا ذہن روح پر کچوکے لگاتا رہا۔ مجھے محسوس ہوتا رہا کہ زندگی سے بڑھ کر مہمل، لغو اور فضول چیز شاید اس دنیا میں کوئی اور نہیں۔ زندگی، میری بے کار زندگی کے سوا۔

اس وقت میری عمر بائیس تیئس سال سے زیادہ نہیں، مگر لگتا ہے کہ میری اصل عمر کا تعین کوئی نہیں کر سکتا۔ شاید میں دنیا کا پہلا انسان ہوں، جسے خدا نے اس کے گناہ کے بدلے جنت سے

دھتکار کر زمین پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا یا پھر ایک وبا سے ختم ہوتی دنیا کا آخری آدمی، جو ایڑیاں رگڑ کر اپنی موت کا انتظار کر رہا ہے۔

میں اس وقت جہاں پر ہوں، وہاں میرے چاروں طرف پتھر کی اونچی دیواروں اور بلند و بالا آہنی دروازوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ دور تک پھیلا ہے۔ تین چار برس پہلے جب مجھے یہاں لایا گیا تو میرے سان گمان میں نہ تھا کہ یہاں قریب سے ایک دریا گزرتا ہے، میں جسے دیکھ نہیں سکتا، صرف سن سکتا ہوں اور اس کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔ میں نہیں جانتا، کب اور کس لمحے وہ دریا میرے اندر آ گیا اور میری تلاطم خیز زندگی سے مل کر سنگت کرنے لگا۔

میری کہانی کا محل وقوع اسی دریا کے بائیں کنارے پر واقع ایک شہر ہے، جو اپنی بوسیدہ عظمت اور گھُن لگی قدامت کے نیچے دبا سسکیاں لے رہا ہے۔ وہ شہر اور اِس کے باسی، ایک بدترین زمانہ حال میں جیتے ہوئے ماضی کی مبہم پرچھائیں معلوم ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ کبھی یہ بے وفا دریا، اِس شہر کی قدم بوسی کرتا تھا، جس کی مہربانی کے طفیل یہ صدیوں پہلے آباد ہوا تھا اور اس کے روٹھ کر دور چلے جانے پر برباد ہو گیا تھا لیکن اس کی بربادی کا یہ عمل آج تک جاری ہے اور اسے پاتال بُرد کرتا جا رہا ہے۔

میری قسمت، جو میری مرضی کے بغیر ترتیب دی گئی، اس میں اسی خرابے کا مکین ہونا لکھا تھا۔ ہمارے جدا جدا نصیب شاید کسی مقصد کے تحت یا اس کے بغیر ہی، آپس میں جوڑ دیے گئے۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ میں اور میرا شہر، پہلے دن سے ایک دوسرے کے جوڑ کے نہیں تھے۔

جب مجھے باہر کے دریا کی کھسر پھسر سنائی نہیں دیتی تو میں اپنی تنہائی کے دریا میں ڈوبنے ابھرنے لگتا ہوں۔ میں اس وقت جہاں پر ہوں، وہاں اونچی دیواروں کے بیچ، انسانی آوازوں کا غوغا ہر وقت بلند ہوتا رہتا ہے، جو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں اپنے آپ کو ان کی آوازوں کی کرختگی اور سفاکی سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ اپنے ذہن میں دوڑتے، شور مچاتے خیالوں کے دھول اڑاتے بگولوں میں سے راستہ بنا کر اس پہلی یاد تک پہنچ سکوں اور اسے دریافت کر سکوں، جس نے میرے بچپن پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ میری ذات کی ٹوٹ پھوٹ وہیں سے شروع ہوئی تھی۔ اُس یاد تک پہنچنے کے لیے مجھے نکیلی آوازوں کے درمیان ایک سرنگ نکالنی پڑتی ہے، کیوں کہ وہ یاد صرف ایک سرا ہے، میری زندگی کی الجھی ہوئی اُس ڈور کا، میں جسے سلجھانا چاہتا ہوں۔

میں کڑکتی دھوپ سے اٹی وہ دوپہر اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کرتا ہوں، جو میرے لیے حیرتوں کا جہان لیے ہوے تھی۔ میرے بابا کا معمول تھا کہ وہ گرمیوں میں ظہر کی اذان کے بعد

اپنی دکان بند کر کے قیلولہ کرنے کے لیے گھر آجاتے اور عصر کی اذان کے فوراً بعد دوبارہ شاہی بازار چلے جاتے اور عشا کی اذان تک دکان پر رہتے۔

جس دوپہر کا ذکر ہے، اُس دن میں اور اماں، بابا کو گھر پر سوتے ہوے چھوڑ کر خالہ رشیدہ کے گھر میلاد میں شرکت کے لیے، اپنے گھر کا دروازہ معمولی سا بھیڑ کر سنسان گلی میں نکل آئے تھے۔

میں نے تب محلے کی مسجد میں قاعدہ پڑھنا شروع ہی کیا تھا، اس لیے مجھے چھوٹا بچہ ہونے کی وجہ سے ایسی محفلوں میں سپارہ پڑھنے کی چھوٹ ہوتی۔ جب کبھی محلے میں قرآن خوانی ہوتی یا میلاد شریف، میرے لیے ان میں دل چسپی کا واحد سامان آخر میں تقسیم ہونے والے موتی چور کے لڈو، بالو شاہی یا نان خطائی وغیرہ ہوتے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام کارروائی مجھے بیزار کن لگتی۔ میں وہاں چپ چاپ بیٹھا، جماہیاں لیتا ہوا تھوڑی دیر کے فرار کی ترکیبیں سوچتا رہتا۔ ایسی جگہوں سے تھوڑی دیر کا فرار بھی کتنا مزے دار ہوتا تھا! میں دھیرے سے کھسکتا ہوا، کبھی اس گھر کی چھت پر یا پھر چپکے سے دروازے سے نکل کر گلی میں چلا جاتا اور وہاں بے مقصد گھومتا پھرتا۔ کبھی کبھار اتفاق سے کوئی ہم جولی مل جاتا تو تھوڑی دیر کے فرار کا لطف دوبالا ہو جاتا۔

اس روز کڑی دوپہر کی وجہ سے ویران گلی سے گزرتے ہوے اماں نے ہمیشہ کی طرح میرا دایاں ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوے چل رہی تھیں، جب کہ

میں ان کے ساتھ تقریباً گھسٹ رہا تھا۔ میں ان دنوں کی حیرانی ابھی تک بھول نہیں سکا کہ سیاہ برقع پہننے کے باوجود وہ تیز تیز کیسے چل لیتی تھیں؟ ان کا اٹھتا ہوا ایک قدم، میرے دو یا تین قدموں کے برابر تھا۔

خالہ رشیدہ سے اماں کی دوستی تھی۔ ان کا گھر دو چھوٹی گلیوں کی دوری پر تھا۔ وہ پرانی طرز کے ایک بڑے مکان میں رہتی تھیں، جس کے دروازے کی لکڑی پر بنے، دھول میں اٹے قدیم نقش و نگار ہمیشہ میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ دوپٹ والے اس دروازے کا ایک پٹ اتنا بھاری تھا کہ تب میں اپنی تمام زور آزمائی کے باوجود اسے نہیں کھول پاتا تھا، جب کہ اماں اسے ایک ہی دھکے سے پورا کھول لیا کرتیں۔ اس روز بھی میری ناکامی کے بعد انھوں نے ایک زوردار دھکے سے وہ بھاری دروازہ پورا کھول دیا تھا۔

ہم جب اندر داخل ہوے تو وہاں نیم تاریک، ہال نما کمرے میں فرش پر دریاں بچھی تھیں۔ جن پر بیٹھی چند عورتیں اپنے اپنے سپارے ہاتھوں میں لیے انھیں پڑھتے ہوے، دھیرے دھیرے ہل رہی تھیں اور ان کی قرات کی بھنبھناہٹ دھیمی دھیمی سنائی دے رہی تھی۔ کمرے کی فضا اگربتیوں کے دھویں اور تیز خوشبو سے بوجھل تھی۔ گلی میں شدت سے محسوس ہوتی گرمی کا اس کمرے میں شائبہ تک نہ تھا۔ جس کی ایک وجہ چھت والے پنکھے تھے اور دوسری وجہ اس

مکان کی گارے مٹی اور کچی اینٹوں سے بنی موٹی موٹی دیواریں تھیں، باہر کی گرمی میں جنھیں عبور کر کے اندر داخل ہونے کی سکت نہ تھی لیکن پھر بھی مجھے اس معطر چھاؤں بھرے ماحول میں آرام سے بیٹھنا دشوار ہو رہا تھا۔

میری خوش نصیبی کہ اماں کمرے میں داخل ہوتے ہی باہر جانے والے راستے کے قریب سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ بیٹھتے ہی انھوں نے فوراً سپارہ اٹھایا اور اسے پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔ عورتوں کی آمد وہاں اب بھی جاری تھی اور تھوڑی دیر بعد پورا کمرہ خواتین سے بھر گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اماں مجھے وہیں پر چھوڑ کر ذرا فاصلے پر اپنی جاننے والی عورتوں کے پاس جا بیٹھی تھیں، جس کی وجہ سے مجھے وہاں سے تھوڑی دیر کے فرار کا موقع مل گیا۔

مجھے ادھ کھلے دروازے سے باہر نکلنے میں دشواری نہیں ہوئی اور میں کمرے کی آسودہ فضا سے نکل کر تیز دھوپ سے بھری ہوئی گلی میں آ گیا، جو اس وقت خالی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود میں ایک لمحہ پچھتائے بغیر اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بلاوجہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ اس وقت وہاں اگر میرے سوا کوئی اور موجود تھا تو وہ صرف ایک لوسی کتا تھا، جو ایک بدرو کے پاس لیٹا وحشت کے ساتھ اپنے پنجے سے پیٹ کھجا رہا تھا۔